اردو ناولوں میں مسیحیوں کی نمائندگی کا کلامیاتی تجزیہ

Critical Discourse Analysis of the Representation of Christians in Urdu Novel

محمد نعیم
ایسوسی ایٹ پروفیسر، ادارہ زبان و ادبیاتِ اردو
پنجاب یونیورسٹی لاہور

This study explores the changing relationship of communities in Colonial and Post-colonial Urdu Literature. It attempts to map out the communal space in the symbolic world of literature given to the Christians over a century by Urdu fiction writers. In colonial India, the missionary activities especially for female education evoked ambivalent responses among Urdu writers. It is interesting to note that female novelists are more accommodating and they presented a positive picture of female Christian characters as compared to the male writers who used female body, social and reformative activities and modern living styles of the Christian females for pleasure. But ironically sometimes presented them as iconic characters of social change. After independence the social position of Christians went through a major change in different parts of the subcontinent. The social space in the ideological Muslim state was very different and somewhat deteriorating for the Christians. Their representation also incorporated these changes. The characters chosen in fiction had a different social background now. This study will help us in understanding the broader communal representation of Christians by digging into the linguistic and intertextual strategies adopted by the Urdu fiction writers.

زبان کا عملی اور ابلاغی استعمال کلامیہ ہے۔ اور اس بات کی جستجو کہ کسی کلامیے کو منطق اور ہم آہنگی کون سے عناصر فراہم کرتے ہیں کلامیاتی تجزیہ کہلاتی ہے۔ کلامیہ زبان کی جملے سے اوپر کی سطح ہے۔(1) یہ متن کی سطح ہے جو زبانی (کوئی بھی اور کسی بھی طوالت کا حامل مکالمہ، خود کلامی) بھی ہو سکتا ہے اور تحریری بھی (ایک پیراگراف سے لے کر کسی بھی ضخامت کی کتاب)۔ افراد کے درمیان کسی بھی سطح اور مقام پہ گفتگو کلامیے میں شامل ہے۔ سکول، منڈی، پارلیمنٹ، کسی بھی جگہ پر افراد کے درمیان ہونے

والے مکالمے کلامیے کی مختلف صورتیں ہیں۔ اس کے علاوہ کلامیہ سماجی عملیدگی (social process) ہے۔ کسی سماج کی مرکزی ثقافتی یا سماجی عملیدگیوں کو کنٹرول کرنے والے مفروضے، توقعات اور وضاحتیں کلامیہ ہیں۔ فوکو نے دکھایا ہے کہ سماجی سرگرمیاں جس معروض (object) کے بارے بول رہی ہوتی ہیں، اسے منظم انداز میں تشکیل دے رہی ہوتی ہیں۔ (2)

تحریر ایک سماجی عمل ہے۔ زبان کا عمومی اور انفرادی (زبانی اور تحریری) استعمال بھی سماجی عمل ہے۔ تحریر کرنا ایک ہنر ہے، جو انسان کسی خاص سماج میں رہ کر سیکھتا ہے۔ اس کے فرد کے طور پہ ایک خاص دورانیے میں وہ یہ مہارت حاصل کرتا ہے۔ اپنے خیالات کو تحریر کی صورت دینا انفرادی فعل نہیں ہے۔ تحریر کی ہنرمندی کو سیکھنے سے لے کر اسے استعمال کرنے اور اس کے ذریعے دوسروں سے ہم کلام ہونے تک کے تمام مراحل سماجی ہیں۔ ایک ایسے سماج میں جہاں خواندگی ہر کسی کی دسترس میں نہ ہو اور جہاں ایسی قابلیت تک سب کی یکساں رسائی نہ ہو، تحریر سیکھنا اور تحریر کے ذریعے ابلاغ میں حصہ لینا ایک سیاسی عمل بن جاتا ہے۔ خصوص ایسے ماحول میں جہاں تعلیم کی طرف راغب کرنے کے لیے ایسا کلامیہ تشکیل دیا جا رہا ہو، جس میں زبانیت (orality) پہ خواندگی کو ترجیح دی جائے، وہاں اس ہنرمندی کا حامل ہونا ایک ایسی برتری رکھتا ہے، جس کا تجزیہ کیا جانا ضروری ہے۔ ہمارے زیرِ مطالعہ عہد کے دوران میں تحریر پہ دسترس اس فوقیت کا اظہار بھی تھا اور ایک فوقی حیثیت سے دوسروں پر اثر انداز ہونے کا امکان بھی۔ تحریر سے منسلک ایک اور اہم خصوصیت سماج سے رابطہ استوار کرنے کی روش ہے۔ انسان، اگر سماجی حیوان ہے تو لسانی منطقہ اس حیوان کو سماجی ہونے کا ایک میدان فراہم کرتا ہے۔

کلامیاتی تجزیے میں ایک اہم اصطلاح آئیڈیالوجی ہے۔ اس اصطلاح کے کئی مفاہیم رائج ہیں۔ کلامیاتی تجزیہ اس مفروضے سے ابتدا کرتا ہے کہ آئیڈیالوجی کلامیے کے اندر گندھی ہوتی ہے۔ یہ کلامیے میں اظہار اور باز تشکیل کے عمل سے گزرتی ہے۔ یہ لسانی اور غیر لسانی ذرائع کی مدد سے اپنا اظہار کرتی ہے۔ یہ محض کلامیے میں ہی نہیں عمل اور تعامل کی دیگر صورتوں جیسے اداروں، تنظیموں اور محکموں کے تناظر میں بھی عمل پذیر ہوتی ہے۔ آئیڈیالوجی کی کوئی ایک صورت نہیں ہے اس لیے اس مطالعے میں ہم مختلف آئیڈیالوجیوں کی بیک وقت موجودگی کے تصور کو لے کر چلیں گے۔ آئیڈیالوجی کسی گروہِ انسانی کے ممبران کو مشترکہ سماجی ادراک فراہم کرتی ہے، ان میں یگانگت کا احساس پیدا کرتی ہے۔ وان ڈائیک (Van Dijk) کے نزدیک آئیڈیالوجی ایک ایسا فریم ورک ہے جس سے کسی سماجی گروہ، تنظیم یا ادارے کے افراد کے درمیان پائے جانے والے مشترک سماجی ادراکات کو منظم کرنے کا کام لیا جاتا ہے۔ یوں آئیڈیالوجی 'ادراکی' اور 'سماجی' دونوں ہیں۔ مجموعی طور پہ آئیڈیالوجی کسی گروہ کے ممبران کو منظم ہونے، اپنے سماجی اعمال اور مقاصد کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے اور اپنے (مراعات یافتہ) وسائل کی حفاظت کرنے میں مدد دیتی ہے، یا اس کے برعکس مخالف یا محروم گرہ سے تعلق ہے تو ان وسائل تک رسائی حاصل کرنے میں معاون ہوتی ہے۔ (3) آئیڈیالوجی کے

تجزیے کے لیے ڈائیک کا ماڈل اور نظری فریم ورک زیادہ کشادہ اور متنوع پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔ اس کے مطابق آئیڈیالوجی صرف مقتدر قوتوں کا طرہ امتیاز نہیں، بلکہ یہ محکوم گروہوں کے ہاں بھی موجود ہوتی ہے، جو انھیں مشترکہ مفادات کے تحفظ کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ جوڑتی ہے۔

ناول، باقی اصنافِ ادب کی مانند، ایک عوامی (public) میدان (Field) ہے۔ یہ افراد کی اجتماعی زندگی کے ساتھ ساتھ ان کی نجی زندگی کو بھی زیرِ بحث لاتا ہے۔ ناول کرداروں کے انتہائی نجی معاملات کو عوامی مباحث میں لانے کا اہتمام بھی کر رہا ہوتا ہے۔ بحیثیت ایک ادبی صنف (genre) یہ نجی اور عوامی منطقوں کو ملانے والے پل کا کام کرتا ہے۔ یہ کسی کردار کے نجی (Private) جذبات اور خیالات کو عوامی منطقے میں داخل کر کے قارئین کے نجی کے تصور اور شعور کو بدل رہا ہوتا ہے۔ یہ ایسا میدان ہے جو نجی مباحث اور مکالموں سے زیادہ اثر انگیز ہے۔ گھر کے اندرون میں ہونے والے مکالموں کو تبدیل کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ کم از کم قارئین کے ادراکی منطقے میں تبدیلی لانے کا امکان رکھتا ہے۔ اردو ناول نے مختلف سماجی مسائل کو موضوع بنانے کے لیے اپنے صفحات پیش کیے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ نجی اور عوامی منطقوں کے بارے نئے تصورات کی تشکیل بھی کر رہا تھا۔ میاں بیوی کے تعلقات ہوں، یا خانگی زندگی سے جڑے معاشی مسائل، ناول ان کے بارے میں مختلف کلامیے عوامی منطقے میں لا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ناول مختلف سماجی گروہوں کے باہمی تعلقات اور ان کے بارے عمومی ادراکی منطقوں کی دریافت اور بعض صورتوں میں تشکیل کا کام بھی کر رہا ہوتا ہے۔ اسی طرح انفرادی یا اجتماعی ادراک میں کسی خاص سماجی / مذہبی گروہ کے بارے عمومی تصورات کا بیانیہ بھی ناول میں تشکیل پا رہا ہوتا ہے۔

کلامیاتی تجزیے میں استعمال ہونے والا ڈیٹا تجزیہ نگار کی مخصوص دلچسپیوں کا غماض ہوتا ہے (4) اور منتخب کیے گئے ڈیٹے کا تجزیہ بھی جزوی طور پہ ہی کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے ہمیں آئندہ صفحات میں اردو ناول کے کلامیاتی تجزیے کے کلی ہونے کا کوئی دعویٰ نہیں ہے۔ یہ ایک ابتدائی کوشش ہے، جو مطالعاتی ماڈل فراہم کرنے کی غرض سے کی گئی ہے۔ ہمارا یہ تجزیہ صوت کی بجائے صرفی، نحوی اور سماجی ڈیٹے سے سروکار رکھے گا۔ ایک اور بات جو ضروری ہے، دستیاب سیکڑوں متون کے لاکھوں الفاظ یا ہزاروں جملوں میں سے تجزیے کے لیے چند ایک کو منتخب کیا جائے گا۔ ویسے بھی اگر کلی تجزیے کی کوشش کی جائے تو شاید ایک متن کے تجزیے پہ ہی اکتفا کرنا پڑے گا۔ یاد رہے کہ بقول براؤن اور یول کسی کلامیاتی تجزیے میں استعمال ہونے والا ڈیٹا ہمیشہ کلامیے کا ایک جزو ہوتا ہے اور تجزیہ کار کو یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ جزو کو کہاں سے شروع کرے اور کہاں ختم۔ (5) ہم نے اپنے تجزیے میں ایسے جملوں، پیراگرافوں، مکالموں اور خصوصاً راوی کے بیانیوں کو منتخب کیا ہے جن کا تعلق مسیحی کمیونٹی سے ہے۔ ہمارے لسانی تجزیے میں جملے

کے موضوع (topicalization) ، مخصوص لفظیات(lexicalization)، مقامی معنی(local semantics) خطابت (rhetoric)اور نمائندگی کے تنوع(variety of representation)پہ رہے گا۔

اردو ناول میں مسیحیوں کی نمائندگی ابتدائی متون سے ہی ملنا شروع ہو جاتی ہے۔ برطانوی راج کی ہندوستانی سماج پہ اثر انداز ہونے کی کوششیں علمی اور ادبی منطقوں میں زیادہ دور رس ثابت ہوئیں۔(محمد نعیم)موجود بیانیوں (داستان، حکایات) سے عدم اطمینان اور نئے بیانیوں کی تشکیل (ناول) میں دل چسپی آئیڈیالوجیکل سطح رکھتی تھی۔ انگریزوں کی بطور حاکم موجودگی اور ان کے مذہب کے سبب مسیحیت کی طرف مقامی ادیبوں کے رویوں میں تنوع اور تضادات موجود ہیں۔ ان میں نمایاں پہلو تو مرعوبیت اور مثبت نمائندگی کا ہے(6) تاہم بعض متون میں مسیحیت کی منفی نمائندگی بھی ملتی ہے۔(7)

انیسویں صدی کے ناولوں میں مسیحیوں کی تین بنیادی حیثیتیں ناول میں جگہ پاتی ہیں، بطور حاکم، بطور مبلغ اور بطور سماجی اصلاحی کارکنان۔ اس عہد کے متون میں ان تینوں نمائندگیوں پہ مثبت پہلو غالب ہے۔ اس اثبات پہ سیاسی انتظام، اخلاقی نظم اور سماجی بہبود سے متعلق پہلے سے موجود تصورات سے زیادہ معاصر ڈسکورس حاوی نظر آتا ہے۔ اس ڈسکورس کے پھیلاؤ اور کنٹرول پہ استعماری نظمِ کلامیہ کی چھاپ واضح نظر آتی ہے۔ دوسرا یہ ڈسکورس مقامی اور استعماری گروہوں کے درمیان ایک مکالمے کی صورت تشکیل پارہا تھا اور اپنی حاکمانہ حیثیت کے سبب برطانویوں کا حصہ اس تشکیل میں غالب تھا۔ مثبت نمائندگی کی ایک وجہ یہ حیثیت بھی ہے۔

نذیر احمد کے ناول توبۃ النصوح میں سماجی زندگی کے ثقافتی مظاہر اور ادبی سرگرمیوں کو مذہبی اصلاحی حدود سے بدلنے کی کوشش کا بیانیہ سامنے آتا ہے۔ اس ناول میں نصوح کے منجھلے بیٹے علیم کی زندگی میں مثبت تبدیلیوں کا سبب ایک پادری صاحب کو بیان کیا گیا ہے۔ مثبت نمائندگی کے کلامیے کو شناخت اور ذہنی ماڈلوں (ڈائیک) کوانفرادی ادراک میں باہم متخالف (ambivalent) اور متناقض (paradoxical) کھیل کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ ایک طرف اس نمائندگی میں اجتماعی آئیڈیالوجی کے پروردہ ادراک کی تصویر کشی کی گئی ہے جس کے مطابق پادری ایک غیر (other) کی حیثیت سے تصوراتی سطح پہ منفی تصویر کا حامل ہے۔ لیکن انفرادی تجربے میں پادری ایک مثبت شخص ہے۔ محض لفظ پادری استعمال کر کے اسے ایک عمومی رنگ دیا گیا ہے، جس سے ذہن شناخت کی جوہر پسندی (essentialism) کی طرف جاتا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار نصوح بیماری کے عالم میں خواب دیکھنے کے بعد اپنے گھر کی اصلاح کرنے کے درپہ ہے۔ وہ یکے بعد دیگرے اپنے اہلِ خانہ کو بلاتا ہے۔ اس کا طرزِ عمل ایک منصف کا ہے، جو سوال وجواب کے ذریعے دوسروں کو اپنے اصلاحی منصوبے کے مطابق ڈھالنا چاہتا ہے اسی۔ دوسری بات یہ بھی

ذہن نشین رہے کہ کسی نام، حلیے یا دیگر کسی اور صفت کی عدم موجودگی میں محض پادری کا لفظ استعمال کرنا سماجی شناخت کی تشکیل کا اہم حربہ ہے۔ پادری کی شناخت کی تشکیل میں شخصی، انفرادی یا عمومی وسائل کے برعکس ایک خاص مذہبی رول کا انتخاب کیا گیا ہے۔ اگر نذیر احمد کے اسمِ بامسمی کرداروں کی پیش پا افتادہ تعبیر سے ملا کر اس تعمیر کو دیکھا جائے تو بات مزید واضح ہو جاتی ہے۔ یہ نمائندگی بیک وقت مسیحی مبلغ کی کلامیاتی تعمیر بھی ہے، اس عہدے سے وابستہ توقعات کی صورت گری بھی اور قارئین کے لیے ایک نمونہ (modelling) بھی۔ ناول کے بیانیے کی ضرورتوں کے پیشِ نظر پادری کا نام یا اس کا تعارف غیر ضروری تصور کیا گیا ہے، لیکن اس کے باوجود اس کا وجود بہت موثر اور طاقت ور نقوش کا حامل ہے۔ اس کی بڑائی دکھانے کے لیے دو صفات کو نمایاں کیا گیا ہے: خاکساری اور ہمدردی۔ ان دو صفات کو بعد ازاں مسیحیت کی شرط قرار دیا گیا ہے۔ پادری کی بڑائی اس سے بھی ظاہر ہے کہ "اکیلے پادری صاحب ایک طرف تھے اور ہندو، مسلمان، سینکڑوں آدمی ایک طرف۔"(8)

نذیر احمد کے ناول میں پادری اور علیم کے مکالمے میں باہمی تعامل کو کنٹرول کرنے کی تدبیر کے تجزیے کے لیے باری لینا (turn-taking) موضوعاتی تعین (topic control) دکھائے گا کہ اس متن میں پادری اور علیم کے تعلق کی نوعیت کیا ہے اور نذیر احمد نے دونوں کی شناخت وضع کرنے کے لیے کن وسائل کو استعمال کیا ہے۔ یاد رہے لسانیات میں کسی مکالمے میں شامل افراد کا کبھی سامع اور کبھی متکلم کا روپ اپنانا باری لینا کہلاتا ہے، جس سے گفتگو آگے بڑھتی ہے۔ یعنی جب مکالمے کا ایک فریق متکلم کا روپ اپناتا ہے تو دوسرا سامع کی حیثیت سے خاموشی اختیار کرتا ہے، اور پہلے کی بات ختم ہونے پر دونوں اپنے روپ تبدیل کر لیتے ہیں اور سامع متکلم بن جاتا ہے اور متکلم سامع، یوں یکے بعد دیگری روپ بدلتے رہتے ہیں اور گفتگو کا سلسلہ تواتر سے جاری رہتا ہے۔ (9) موضوع کا کنٹرول کس کے ہاتھ میں ہے، اور پادری کس طرح علیم کو ایک خاص پہلو پر لانا چاہ رہا ہے۔ علیم کی "شرمندگی" کو قائم کرنے میں پادری کی "خاکساری" اور "ہمدردی" کو خصوصی دخل ہے۔ مکالمے میں پادری اور علیم کو کتنی جگہ دی گئی ہے؟ پادری کا سوال موضوعاتی تعین کی اہم مثال ہے۔ اس کے سوال کے جواب سے علیم کے ردعمل کا ظہور دکھا رہا ہے کہ پادری کو اس مکالمے میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ علیم کا سابقہ ایک فرد سے نہیں پڑا۔ اور علیم یہاں ایک آزاد فرد کے طور پر مکالمے کا حصہ نہیں بن رہا۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ کیا کلامیے میں کوئی مکالمہ ایسا ہوتا ہے جس میں شامل کوئی ایک فرد بھی آزاد حیثیت رکھتا ہو؟ کیوں کہ مکالمے کا مقام اور موجود صورتِ حال شاملِ مکالمہ افراد کی حیثیتوں کا تعین کر رہی ہوتی ہے۔ ایسے تعین پر سماجی کردار بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ زیرِ تجزیہ مثال میں پادری اور علیم دونوں افراد کی حیثیت کے ساتھ ساتھ اپنے سماجی پس منظر اور رول کے اندر روبہ عمل ہیں۔ پادری کے سامنے علیم کی سماجی شناخت اور دونوں کے درمیان تعلق کی نوعیت علیم کے ردِ عمل (لسانی، عملی) کو متعین کر رہی ہے۔

نذیر احمد کے ناول میں پادری کی نمائندگی میں اس کی بردباری اور علمیت کو فوق انسانی بنا دیا گیا ہے۔ وہ اکیلا سینکڑوں کا مقابلہ حلم سے کر رہا ہے۔ علیم کو اس کے سامنے اپنی ادبی کتابوں کی قرات کرتے ہوئے حیا آتی ہے۔ پادری کے سامنے بہارِ دانش کی قرات سے یک دم فحاشی بر آمد ہو جاتی ہے۔ پادری کو اخلاقی برتری حاصل ہے جو ہندوستانی مسلم نوجوان میں مذہب کی اصل روح پیدا کرنے کا سبب بنتا ہے۔ اگر محض مذہبی حیثیت میں دیکھا جائے تو مسیحی مبلغ کی واضح برتری کلامیاتی میدان میں اس کی محکم حیثیت کو سامنے لا رہی ہے۔ اصلاح کا کلامیہ مقامی کمزور سماجی ردِ عمل سے تقویت پکڑتا ہے۔

پاکستان کے قیام کے بعد مسیحی ایک مختلف حیثیت سے سامنے آئے۔ اب اردو ناول کے بیانیے میں دیسی مسیحیوں کا ذکر ملتا ہے اور ان کی نمائندگی پہ اس سماجی درجہ بندی اور مقام کی جھلک واضح دیکھی جا سکتی ہے جو مسلم اکثریتی ملک میں انھیں انگریزوں کے جانے کے بعد حاصل ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کے ناول راکھ میں مسیحی شناخت ایک متناقض اور تشکیل پذیر صورت میں پیش ہوئی ہے۔ اس ناول کے مرکزی کردار کی مشاہد کی بیوی برگیتا ایک مسیحی ہے جس کا تعلق سویڈن سے ہے۔

"برگیتا میں سویڈش پن بہت تھا۔ وہ تقریباً کچے گوشت کے ٹھنڈے سینڈوچ بناتی تھی، انھیں بس نگلا جا سکتا تھا۔ اس کے باوجود اس [مشاہد] نے کبھی شکایت نہیں کی تھی۔"(10)

برگیتا جملے کا مرکزی نقطہ ہے اور دونوں کے تعلقات میں اس کی مرکزی حیثیت بھی نمایاں ہو رہی ہے۔ مجامعت میں اسی کی مرضی چلتی ہے اور جملے کا دوسرا حصہ مشاہد کی حسرت کو بیان کر رہا ہے۔ مشاہد اسے کرسمس کی مبارکباد دینا بھول گیا ہے، جسے برگیتا محسوس کرتی ہے۔ اسے کرسمس ٹری کا انتظام نہ ہونے کا تاسف ضرور ہے، لیکن کرسمس کے لیے پہاڑوں سے چیڑ کے نوجوان درختوں کو چوری چھپے اکھاڑ کر لانے کو وہ شرمناک کہتی ہے۔(11)

برگیتا سیاہ فام ہے، سویڈش ہے، اس کی تعمیر میں ان پہلوؤں کی طرف توجہ دی گئی ہے، جو پاکستانی اجتماعی تیقنات (علم، معلومات اور آرا) کے پس منظر میں واضح ہوتے ہیں۔ ناول کے شروع میں ہی ملاح کے سؤر کا نام نہ لینے کے مقامی رواج کا تذکرہ موجود ہے۔ برگیتا کا پاکستان کی روشن صبح میں سویڈن کے دھند میں لپٹے کرسمس کو یاد کرنا، باپ کا موٹر بوٹ کی مرمت میں دن گزارنا اور ماں کا کسی اور مرد کے ساتھ چلی جانا، ایسی باتیں ہیں، جن کی معنویت پاکستانی ذہن کے سیاق و سباق میں بامعنی ہو رہی ہے۔ ایک سیاہ فام سویڈش لڑکی کو منتخب کرنا ایک طور سے استعماری دائرہ کار سے خود کو الگ کرنے کی کوشش ہے۔ ایک پاکستانی اپنے طور پہ دنیا کے ان حصوں کو دریافت کر رہا ہے اور ان سے ایک متوازن تعلق قائم کر رہا ہے، جو کم از کم استعماری دور اور بعد میں بھی انگریز کے ساتھ ممکن نہ تھا۔

یہاں کرسمس ایک مذہبی تہوار کے طور پہ ضرور آیا ہے، لیکن اس کی معنویت اور اہمیت برگیتا کے سبب سے ہے۔ اس کا مذہب مشاہد کے مذہب سے تقابل کا ذریعہ نہیں بنا، دونوں کی مذہبیت کے اشتراک یا اختلاف کو موضوع بنایا گیا ہے۔

برگیتا کی سیاہ فامی کو پابلو نیرودا کی سر لنکن بھنگن سے والہانہ محبت کے ساتھ منسلک کیا گیا ہے۔ جو اس بات کا اشارہ ہے کہ حقیقی دنیا سے ہمارے تعلق کی نوعیت محض ہمارے مشاہداتی، حسی یا ذہنی تجربات کی مرہون نہیں ہوتی، بلکہ ہمارے ادراک میں ادبی اور دیگر فنون کے تجربات کا خاطر خواہ حصہ ہوتا ہے۔ ہمارا عملی زندگی ذوق، ہمارے ادبی ذوق سے متاثر ہوتا ہے۔

برگیتا کا کمرے سے یکلخت باہر لان میں برہنہ چلے آنا مشاہد کو کھٹکتا ہے، جسے برگیتا قبائلی ٹیبوز اور یقین قرار دیتی ہے، جن سے مشاہد تمام تر لبرلزم کے باوجود نکل نہیں پایا۔ برگیتا کے لیے غسلِ آفتابی بدن کے سانس لینے کا عمل ہے اور زندگی کا لازمی حصہ ہے۔ مشاہد کی بہنیں برگیتا کو کامونکے کے مقامی مسیحیوں کی اولاد سمجھتی ہیں۔(12) جس پر مشاہد شرمندہ ہے اور برگیتا سے معذرت بھی کرتا ہے۔ یہیں متن میں کچھ آگے اس کا سبب بھی موجود ہے۔

> "اس سے آگے چڑیا گھر کے آس پاس سستے اور بھڑکیلے لباسوں میں، غبارے ہاتھ میں، تیز میک اپ جو سیاہ چہروں پر چمکتا تھا۔ ہائی ہیلز میں ٹھپ ٹھپ چلتی ایسی عورتیں جنھیں سیدھا ہو کر چلنے کی عادت نہیں ہو رہی تھی۔ آج ان کی بھی ہیپی کرسمس تھی۔
>
> "نیں ہیپی کرسمس ٹو یو۔۔۔"
>
> "سیم ٹو یو نیں۔۔""(13)

برگیتا ان مقامی مسیحیوں کو دیکھ کر تذبذب میں پڑ جاتی ہے کہ کیا وہ ان میں سے ہے؟ برگیتا کی یہ کشمکش ظاہر کرتی ہے کہ مذہب، نسل اور طبقہ تینوں انسانی شناخت کی تشکیل میں mediate کرتے ہیں۔ جب مردان کی رننگ کمنٹری میں بھنگی کی دونوں الگ شناختوں (بین الاقوامی، یورپی اور مقامی دیسی) کا بیک وقت ذکر ہوتا ہے تو وہ لمحہ جیپ میں موجود مشاہد، برگیتا اور مردان کے لیے شرمندگی کا سبب بن جاتا ہے: "برگیتا کے چہرے کا رنگ بدلا لیکن اس نے مڑ کر مردان کی طرف نہیں دیکھا اور اس کے باوجود مردان کو احساس ہو گیا۔ "سوری بھابی آئی ڈڈ ناٹ مین اٹ "(14) برگیتا اگرچہ بعد میں وضاحت کرتی ہے کہ وہ جانتی ہے کہ بھنگی ایک سکھ قبیلہ ہے اور اس سے کرسمس والے بھنگی مراد نہیں تھے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ مردان اور مشاہد کے ردِ عمل سے واضح ہے کہ تینوں کے لیے مقامی مسیحی شناخت شرم کا باعث ہے، جسے کوئی بھی خوش دلی سے قبول نہیں کرنا چاہ رہا۔ راوی کا عمومی مشاہداتی بیان، بعد ازاں

برگیتا کی اندرونی کشمکش اور پھر مر دان کی کنٹری میں مسیحیوں کا ایک مقامی تحقیری مخصوص لفظ(lexicalization) بھنگی کا استعمال اور مشاہد کا شرمندگی سے بھرپور ردِ عمل سبھی یہ ظاہر کر رہے ہیں کہ مسیحی شناخت پاکستانی سماج پر دے پر داغ کی طرح دیکھی جارہی ہے، جسے برابر یا ایک ضروری دھاگے کی حیثیت حاصل نہیں۔

راکھ کے بیانیے میں مسیحی شناخت مسلسل ابھرتی ہے۔ کولونیل زمانے کے آثار کے بیان میں اور دیسی مسیحیوں کی نمائندگی میں واضح فرق کے باوجود ان کا باہمی تال میل مجموعی شناخت کی تشکیل میں زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ مشاہد اور مر دان دونوں کے لیے بچپن کے لاہور کی قیمت پر ترقیاتی کاموں کا ہونا ناپسندیدہ ہے۔ ان کے مشترک شعور میں لاہور کا مطلب کثیر ثقافتی شہر ہے، جس میں سکھ، ہندو، مسیحی اور مسلمان سب شامل ہیں۔ خود مسیحی اور مسلم شناخت کو اکہری نہیں دکھایا گیا اور نہ ان کی متضاد ثنوی پروٹو ٹائپ تصویر کشی کی گئی ہے۔ کرسمس کے دن لاہور کے مختلف حصوں سے گزرتے ہوئے مشاہد، برگیتا اور مر دان کے مشاہدے اور گفتگو کے ذریعے ان مظاہر کا بطورِ خاص ذکر کیا گیا ہے جو لاہور کی کثیر ثقافتی تصویر کو نمایاں کریں، لکشمی مینشن، بھنگی توپ، گورنمنٹ کالج، گڈ اولڈ مسلم ماڈل سکول اور سر کلر روڈ کا مسیحی قبرستان سبھی اس مجموعی تصویر کا حصہ ہیں۔ یہاں بادشاہی مسجد کا ذکر کپلنگ کے ساتھ ہوا ہے اور اس تصویر میں لاہور کے چھجے، چوبارے اور مینارے لازمی رنگوں سے پینٹ ہوئے ہیں۔

عبد اللہ حسین کے ناول نادار لوگ میں مسیحی کر دار موجود ہیں، جو پادری بھی ہیں اور اینگلو انڈین بھی۔ اس کے علاوہ یہاں بھٹہ مزدور مسیحی کر دار موجود ہیں، جو مسلم شیخوں کے ساتھ بھٹے پہ پیشگی پر نسل در نسل کام کر رہے ہیں۔ ان دونوں گروہوں کا ایک ساتھ آنا ظاہر کر رہا ہے کہ مسیحیوں کی پاکستانی سماج میں حالت افتاد گانِ خاک سے زیادہ نہیں۔ (15) اس نمائندگی میں طبقاتی اور مذہبی دونوں مظلوم شناخت کی تشکیل میں موجود ہیں۔ خود ناول نگار اس کی کشش کو ابھارتا ہے اور مرکزی کر دار اعجاز سے محبت بھرا تعلق بھی سامنے لاتا ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد لکھے گئے ان دونوں ناولوں میں پاکستانی مسیحی شناخت کی طرف ناول نگاروں کا رویہ ہمدردانہ ہے۔

حسن منظر نے اپنے ناول ماں بیٹی (2010) میں دو مسیحی خواتین کو مرکزی کر دار بنایا ہے اور سماج کی طرف سے ان کی مذہبی شناخت کے سبب پیدا ہونے والی مشکلات کو بتفصیل بیان کیا ہے۔ اس ناول میں صنف اور مذہبی شناخت دونوں کی وجہ سے پاکستانی سماج میں در پیش مشکل صورتِ احوال کی نمائندگی ملتی ہے۔ ایک محدود حلقے میں ہی ان کے اصل نام کی خبر ہے۔ ناول نگار گھر کے اندرون میں جب بھی ماں بیٹی کے بارے بیانیے میں تفصیلات فراہم کرتا ہے، تو انھیں ان کے مسیحی نام سے مخاطب کرتا ہے، جبکہ ایک محدود دائرے سے باہر ان کی قبولیت شدہ سماجی شناخت ظاہر کی گئی ہے۔ یوں دونوں شناختوں کی آر جار سے کر داروں کے

ہاں سماجی دباؤ اور انفرادی و سماجی شناخت کے درمیان تناؤ کو سامنے لایا گیا ہے۔ ان کو پسند کرنے والوں کا جہاں ذکر ہوا ہے تو نام آمنہ اور صومیہ استعمال کیے گئے ہیں، جو ظاہر کر رہے ہیں، کہ ان دونوں کرداروں کی قبولیت ان کی اس شناخت سے ہے۔ آمنہ اور صومیہ نو مسلم ہیں۔ صومیہ کے ہاں ترک شدہ مسیحی زندگی کے لیے کسک موجود ہے۔ جبکہ ماں سے بھی کوئی نہ کوئی پرانی حرکت جیسے مسیحیوں کا ہاتھوں سے کراس بنانا، سرزد ہو جاتی ہے، جسے وہ بے حرمتی تصور کرتی ہے۔ بیٹی کو مسیحیت میں رہتے ہوئے موسیقی سیکھنے کے امکانات کے معدوم ہو جانے کا افسوس ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ کاش ماں نے یہ نئی شناخت اختیار نہ کی ہوتی۔ ماں نے یہ شناخت جس شخص (حمزہ) کی مدد سے اختیار کی ہے، وہ انھیں چھوڑ کر جا چکا ہے۔ ماں بیٹی کے درمیان ہونے والے مکالمے کلیرس کی کسمپرسی کی زندگی کا اظہار ہیں۔ محدود معاشی وسائل کے سبب جورجیانا سکول چھوڑ دینے کی بات بھی کرتی ہے، جس پر آمنہ پوچھتی ہے کہ تعلیم کے بغیر وہ کیا بنے گی۔ جورجیانا کا جواب کہ وہ گھریلو خاتون بنے گی، کلیرس کی بطور بیوی کرب ناک پہلوؤں کو جگا دیتا ہے۔ اس کا جملہ شدتِ غم اور خوف سے لبریز ہے: "عورت کے لیے سب سے برا پیشہ ہاؤس وائف ہونے کا ہے بلکہ وائف ہونے کا۔"(16)

کلیرس کی زندگی کافی تلخ ہے۔ اس کے باپ نے کبھی اس کی ماں سے شادی نہ کی، جو اس کے گھر میں ملازمہ تھی۔ کلیرس نے اپنی زندگی میں پائے جانے والے خلا کو پر کرنے کے لیے مذہبی لٹریچر پڑھنا شروع کیا، مسلمان ہو گئی۔ اس سے شادی کرنے والا حمزہ ایک عام پیدائشی مسلمان تھا جسے مذہب کے بارے زیادہ جانکاری نہ تھی۔ اس سے علیحدگی کے بعد کلیرس کی مدد کرنے کے لیے ڈاکٹر فتح یاب آیا، جو اس سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ حمزہ کے انتقال کی خبر اسے ملی۔ جس کے بعد ایک طاقت ور مرد بن فتح نے ایک رکشے والے کو اس کے پیچھے لگا دیا گیا اور اپنے قریب کرنے کی دھمکی آمیز کوششیں کیں۔ کلیرس دہرے عذاب میں گرفتار تھی۔ مسیحیت چھوڑنے پر چرچ یا مسیحی کمیونٹی اس کی مدد کرنے پر تیار نہ تھی، اور دوسری طرف مسلم کمیونٹی کے مرد اس سے اپنا فائدے نکالنے کے پھیر میں تھے۔ ڈاکٹر فتح اسے زبردستی اپنے گھر لے گیا اور اپنی بیوی کے ساتھ بستر میں سلانے کی کوشش کی۔ ایسا ہی اس کا اپنا شوہر حمزہ کر چکا تھا۔ وہ فتح سے لڑائی کر کے خود کو بچانے میں کامیاب ہو گئی۔ یوں ایک مردانہ سماج میں اجیرن اور ناکام زندگی گزارنے والی کلیرس اپنی بچی جیورجیانا کے لیے سخت پریشان ہے کہ اسے بہتر زندگی ملے۔

فتح کے ساتھ اس رات جا کر کلریس نے گھر سے نکلنا چند دن بند رکھا اور جورجیانا کو بھی کھڑکی پر سے باہر دیکھنے کو منع کر دیا تھا۔ ایک میں انھیں تیزاب پھینکے جانے کا خطرہ تھا، دوسرے میں گولی کا۔(17)

حسن منظر نے لگی لپٹی رکھے بغیر پاکستان کے مردانہ سماج میں عورت کی طرف سے انکار یا دھتکارے جانے پر مردوں کے عمومی ردِ عمل کی بھیانک مثال سامنے رکھ دی ہے۔ماں بیٹی کی مقامی سماج میں قبولیت اور مشکلات دونوں ان کی نئی شناخت کے نتائج میں شامل ہیں۔سماجی دباؤ کو مختلف طریقوں سے ظاہر کیا گیا ہے۔جورجیانا ایک کتاب پڑھ رہی ہے، ساتھ ہی راوی یہ بیان بھی دیتا ہے کہ اسے یہ مضمون پسند نہیں۔اس کی ناپسندیدگی کے اظہار کے لیے فعل "پھٹاکے" استعمال کیا گیا ہے، جو شدت کو ظاہر کر رہا ہے اور صوتی تاثر بھی دے رہا ہے۔

کلیرس اور جورجیانا کی مدد ایک بوڑھی بیوہ کرتی ہے، جو مدینے میں رہ رہی ہے کہ اسے وہیں کی خاک بننا ہے۔اس کے لیے کلیرس کے الفاظ اس کی شخصیت کی عظمت کو بیان کرتے ہیں:

وہ اپنی اکیلی ذات میں وہ تھیں، جو پوری مشن سوسائیٹیز ہوتی ہیں۔بغیر مشن سوسائیٹیز کو ملنے والی امداد کے۔(18)

ان ناولوں میں دیکھا جاسکتا ہے کہ مسیحیوں کی نمائندگی اردو ناول میں تغیر آشنا رہی ہے۔اور اس نمائندگی پہ ایک واضح اثر کولونیل دور کے خاتمے نے ڈالا ہے۔کولونیل دور میں حکمران اور مذہبی مبلغین کی نمائندگی پہ مثبت پہلوؤں کا غلبہ ہے۔اگر کہیں مسیحیوں کی نمائندگی میں منفی پہلو نمایاں بھی ہوئے ہیں تو وہ تاریخی پس منظر کے طور پہ ابھرتے ہیں۔خود مسیحی پادریوں اور ننوں کی منفی اور اخلاق سوز نمائندگی پیش کرنے ولاے شرر کے ہاں بھی ان کے آخری ناول(شرر، طاہرہ 1923) میں ایک بے اولاد مسیحی جوڑے کی نمائندگی مثبت ہے جو اپنے ملازم کی بیٹی کی نہ صرف پرورش کرتے ہیں، بلکہ اپنی تمام جائیداد اس کے نام کر جاتے ہیں۔اس کے برعکس قیامِ پاکستان کے بعد کے ناولوں میں مسیحی شناخت کی نمائندگی پر کسمپرسی غالب ہے۔اس شناخت کا دوسرا نمایاں پہلو صنف ہے۔یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ سماجی محرومی کی صورت گری کے لیے غیر مسلم اور صنف دو بنیادی متغیرات زیادہ استعمال ہوئے ہیں۔ایسا نہیں کہ مرد مسیحی کرداروں کی نمائندگی میں اثبات کا عنصر غالب ہو، لیکن زیادہ تر محرومی کی نمائندگی میں تانیثیت کا پہلو محرومی کو دوچند کر دیتا ہے۔

حوالہ جات

1. Baxter, Judith. *Positioning Gender in Discourse: A feminist Methodology .* New York : Palgrave Macmillan, 2003.

2. Fairclough, Norman. *Language and Power.* 3rd. Oxford: Routledge, 2015.

3. Dijk, Teun A. Van. ", "Discourse Analysis as Ideology Analysis"." In *Language & Peace*, by C Schaffne, & A L Wenden, 17-33. London: Routledge, 1995.

4. Brown, G, and G Yule. *Discourse Analysis* (*C*ambridge: Cambridge University Press, 1983), 68.

5. Ibid, 69.

6. نعیم, محمد" .انیسویں صدی میں اردو کے اصلاحی ناول ". تخلیقی ادب.9 no. ,(2011):283-313

7. عبدالحلیم شرر، فلورااور فلورنڈا .لاہور: مکتبہ القریش,1986.؛ محمد نعیم،" اردوناول میں مذاحمتی تذبذب،"اورینٹل کالج میگزین86، 1 .no (جنوری-مارچ.2011):181-202

8. نذیر احمد، توبۃالنصوح.،مرتبہ سبط حسن(لاہور: مجلس ترقی ادب,1994)،211۔

9. Sacks, Harvey, Emanuel A. Schegloff, and Gail Jefferson. "A Simplest Systematics for the Organization of Turn-Taking for Conversation." *Language* 50, no. 4 (1974): 696–735. https://doi.org/10.2307/412243.

10. مستنصر حسین تارڑ," راکھ "مشمولہ مجموعہ مستنصر حسین تارڑ: بہاؤ،راکھ، قربتِ مرگ میں محبت(لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز,2008)،234۔

11. ایضاً،241۔

12. ایضاً،3-242

13. ایضاً،250۔

14. ایضاً،252۔

15. عبداللہ حسین،،نادارلوگ (اہور:سنگِ میل پبلی کیشنز,1997)

16. حسن منظر، دو مختصر ناول: بیر شیبا کی لڑکی اور ماں بیٹی (کراچی: شہرزاد،2010)،85۔

17. ایضاً،132۔

18. ایضاً،139۔